انکارِ شریعت کے مُضمرات

جناب محمد اسلم طاہر - ایم - اے

اُمتِ مسلمہ میں اِس وقت لسانی، علاقائی اور فقہی اختلافات کی جو کیفیت ہے، اہلِ درد اس پر پہلے ہی دل گرفتہ ہیں۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ ان اختلافات کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کی جاتی اور بنیادی نکات پر زیادہ سے زیادہ اتفاق و اتحاد کا اہتمام کیا جاتا۔ پرائیویٹ شریعت بل اِس لحاظ سے ایک اہم پیشکش ہے۔ مسلمانوں کے مختلف مکاتیبِ فکر کا اس پر اجماع بے مثال ہے۔ بعض علمائے کرام کے سیاسی اختلاف سے قطع نظر یہ بِل واقعۃً قرآن و سُنّت کے عمومی مزاج کا عکاس ہے۔ اِدھر المیہ یہ ہے کہ شریعت بل کی مخالفت کی آڑ میں سرے سے شریعت ہی کو متنازعہ بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے[۱]۔ مسلّمہ اسلامی اُصولوں کی تردید کے لیے علمائے کرام کو نشانۂ تنقید بنانا فیشن بن گیا ہے۔ سندھو دیش تحریک کے بانی جی۔ ایم۔ سیّد نے یہ کہہ کر اسلام سے منحرف بہت سے ترقی پسند اہلِ قلم کو زبان دے دی ہے کہ "میں اسلام کی مُلّا والی تشریح کو نہیں، صوفیا والی تشریح کو مانتا ہوں"[۲] اس تشریح کا ایک ادنیٰ سا

[۱] آجکل کسی تحریک کو ناکام بنانے کا طریقہ یہی ہے کہ پہلے اسے متنازعہ بنا دو۔
[۲] بات مرضی اور پسند کی ہو تو وہ کہہ سکتا ہے کہ میں اپوا کی تشریح کو مانتا ہوں یا کمیونسٹوں کی تفسیر اچھی لگتی ہے۔ جو پسند آگیا وہ اصلاحی اسلام بن گیا۔ یعنی (باقی بر صفحہ آئندہ)

شاہکار یہ ہے کہ محمد بن قاسم ڈاکو اور راجہ داہر ہیرو قرار پائے۔ اِس سلسلے میں "اصلاحی اسلام" کی اصطلاح کو بھی رواج دیا جا رہا ہے۔ اس "اصلاحی اسلام" کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں اسلام کی رہنمائی میں اجتماعی اصلاح کی فکر کم ہے، البتہ دورِ جدید کے بعض گمراہ کُن رجحانات کی پیروی میں اسلامی اُصولوں کی ترمیم و تنسیخ سے دلچسپی زیادہ ہے۔ ہمارے اِن جدت پسند دوستوں کے فرمودات کی روشنی میں اسلام کی جو اصلاحی اور جدید تصویر بنتی ہے، اس کے کچھ نقوش ملاحظہ ہوں:

۱۔ نفاذِ شریعت کے بہت سے مخالفین کو اسلام کا اُصولِ اجتہاد کچھ زیادہ ہی مرغوب ہے۔ اِس حد تک بات قابلِ اعتراض بھی نہیں لیکن اس سے بڑھ کر ان حضرات نے بطورِ خود جو اجتہادی کاوشیں پیش کی ہیں، اس کے بعد یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اجتہاد اور ارتداد میں فرق کیا ہے۔ "روایتی تصور" کے مطابق عقائد اور عبادات کے معاملے میں اجتہاد نہیں ہو سکتا نیز اجتہاد ہر کہ و مہ کا کام نہیں۔ اس کے لیے خاص اہلیت اور شرائط درکار ہیں۔ "جدید تصور" کے مطابق اجتہاد، معاملات تو کجا عقائد و عبادات تک میں بھی ممکن، بلکہ لازمی ہو گیا ہے۔ اس اجتہاد کا حق بھی زیادہ تر قرآن و سنّت سے نابلد بعض سرکاری افسران کی بیگمات یا فلم اور ٹی وی کے چند فن کاروں کو حاصل ہے۔ چنانچہ قانونِ شہادت، دیت اور شریعت بل کے خلاف بیگمات نے لاہور اور اسلام آباد میں جو مظاہرے کیے وہ اِسی جدید تصورِ اجتہاد کا قدرتی نتیجہ ہیں۔ پھر اس اجتہاد کا دائرہ عمل اتنا وسیع ہے کہ حدیث تو کیا، قرآن کی نصِ صریح بھی اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔ چنانچہ جوشِ اجتہاد میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ "ہم اقبال کے پیغامِ تغیر پسندی کو آگے لے جانے والے ہیں اور اقبال نے اپنے ایک خط میں قرآنی نص میں بھی اجتہاد

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

کسوٹی نبی اکرمؐ نہیں ہیں، جی ایم سید اور مہناز رفیع جیسے فدائیینِ شریعت ہیں، جو ان کی پسند وہ برحق!

کی بات کی ہے۔"

(فکر اسلامی کی تشکیلِ نو۔ ایک گفتگو" وارث میر جنگ ۸ر فروری ۸۶ء)

چونکہ جدید دور میں یہ دانشور شریعت کے ہر اصول کی تعبیر نو کے مدعی ہیں، اس لیے عقائد و عبادات تک کے بارے میں جابجا تعبیرات کا ایک ذخیرہ جمع ہو چکا ہے۔ خدا اور نماز کا جو مفہوم معروف و مسلم ہے اس کی تعبیر نو اشتراکی رہنما فیروز الدین منصور نے یوں کی تھی کہ "قبیلوں کی باہمی رقابتوں اور لڑائیوں کو ختم کر کے عربوں کو متحد کرنے کے لیے قبائلی دیوتاؤں کا خاتمہ اور ایک خدا پر ایمان ضروری تھا" بین السطور پیغام یہ ہے کہ اب جب کہ عالمِ اسلام کو عموماً اور پاکستان کو خصوصاً لاتعداد قومیتوں میں بانٹنا مطلوب ہے تو عقیدۂ توحید جدید سیاسی حالات کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ جہاں تک نماز کا تعلق ہے ترکی کے مردِ آہن مصطفےٰ کمال اتاترک نے عربی کے بجائے ترکی زبان میں اذان و نماز کی ادائیگی کا حکم دیا تھا۔ عالمِ اسلام کے سیکولر عناصر کے نزدیک اتاترک آئیڈیل شخصیت ہے چنانچہ یہاں بھی اردو میں نماز کی تحریک چلی تھی۔ علماء کی مزاحمت کے باعث یہ تحریک پروان نہ چڑھ سکی۔ بایں ہمہ نماز کی بابت جدید نظریات کی کمی کی شکایت نہ ہونی چاہیے۔ بیگم نسرین سرفراز نے ایک بیان میں فرمایا تھا۔" اگر عورت کی گواہی نصف ہے تو نماز بھی نصف ہونی چاہیے"۔ خدا اور نماز کے بارے میں اس ارتقائی اور حرکی تصور کی تان بالآخر ملک کی ایک گلوکارہ کے اس بیان پر ٹوٹتی ہے کہ "موسیقی میری نماز اور سُر میرا خدا ہے"۔

۳۔ "اصلاحی اسلام" میں طلاق اور شادی کے مسائل پر بھی طبع آزمائی کی گئی ہے۔ پہلے اعتراض یہ تھا کہ غصے میں دی گئی طلاق کیسے مؤثر ہو سکتی ہے۔ گویا طلاق بیوی کی کسی بات پر خوش ہو کر دی جاتی ہے۔ اب طعنہ یہ ہے کہ تفننِ طبع کے طور پر بیوی کو تین دفعہ طلاق کہہ دینے سے کیا ہو جاتا ہے۔ گویا طلاق بھی ایک کھیل تماشہ ہے جسے حسبِ خواہش شروع اور ختم کیا جا سکتا ہے۔ پچھلے دنوں ایک ٹی وی ڈرامہ کے حوالے سے دو فنکار میاں بیوی کی ازدواجی زندگی کے بارے میں جو ناگوار صورتِ حال پیدا ہوئی، اُس کی

وجہ اسلام کے اُصولِ نکاح و طلاق سے افسوسناک حد تک لاعلمی کہی جا سکتی ہے۔ ہمارے بعض جدید اہلِ قلم علماء کو تجدید تقاضوں سے بے بہرہ ہونے کا الزام دیتے ہیں، لیکن خود بیں اسلامی اُصولوں کی نزاکت سے بہرہ ور ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ شادی کے متعلق بھی نظری اور عملی طور پر اسلامی احکامات کی تضحیک کی مثالیں عام ہیں۔ ہندوستان اور مقبوضہ کشمیر میں اونچے گھرانوں کی مسلمان خواتین کے غیر مسلم مردوں سے نکاح کی اطلاعات عام ہیں۔ اس سلسلے میں بھارت میں یونیفارم سول کوڈ کے نفاذ کی تحریک سرکاری سرپرستی میں بعض ترقی پسند مسلمانوں کے تعاون سے چل رہی ہے۔ اسلامی کونسل آف انڈیا کے سیکرٹری جنرل محمد یونس مسلم نے کہا ہے کہ "یہ تحریک خدانخواستہ کامیاب ہو گئی تو بھارت سے شریعت ختم ہو جائے گی"۔ شادی کے بارے میں ایک مشہور پاکستانی اداکارہ نے برطانوی فلسفی رسل کے قول کو اون کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "شادی قانونی فحبہ گری (LEGALISED PROSTITUTION) کا دوسرا نام ہے" کیا عجب کہ ترقی کی مزید منازل طے کرنے کے بعد شادی کے لیے قانونی طریقۂ کار بھی ایک بے جا پابندی قرار پائے۔ احسان دانش مرحوم نے غالباً اسی اندیشے کا اظہار کتنے دکھ بھرے الفاظ میں کیا تھا۔ "اب وہ وقت آ رہا ہے جب لوگ ہمارے پوتوں پہ اُنگلی اُٹھا کر کہا کریں گے کہ تمہارے دادا کے گھر میں منکوحہ عورت تھی"۔

۴ ۔ مشہور و معروف اسلام میں خواتین کو چادر اور چار دیواری کے تحفظات حاصل ہیں۔ اس بنا پر کھیلوں کے مخلوط بین الاقوامی مقابلوں میں پاکستانی خواتین کو شرکت کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اس جرم کی پاداش میں بھی علمائے کرام ہی ہدفِ ملامت بنتے ہیں۔ ایسے مقابلوں میں خواتین کی شرکت کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ انڈونیشیا اور ملائشیا وغیرہ اسلامی ممالک کی خواتین اگر غیر مردوں کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کر سکتی ہیں تو ایسا کرنے سے پاکستانی خواتین کے اسلام کو کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ کسی بھی جگہ کسی خلافِ اسلام ضابطے کا نفاذ کسی دوسری جگہ ایسے ہی ضابطے کی ترویج کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ ترکی میں ملک کی اعلیٰ تعلیمی کونسل

نے مردوں کے لیے ڈاڑھی اور عورتوں کے لیے نقاب نیز طالبات کے لیے دوپٹہ تک اوڑھنے کی ممانعت کر رکھی ہے۔ چنانچہ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر ارمان عسکری کو ملازمت سے صرف اس لیے علیحدہ کر دیا کہ انہوں نے سرکاری ہدایت اور انتباہ کے باوجود ڈاڑھی منڈوانے سے انکار کر دیا تھا۔ جاوا (انڈونیشیا) کے تعلیمی اداروں سے ایسی چھ سو طالبات کو خارج کر دیا گیا، جو سر ڈھانپ کر آتی تھیں اور سرکاری طور پر مقرر کردہ لباس منی سکرٹ کو زیبِ تن کرنے کے لیے تیار نہ تھیں۔ چند مسلمان ممالک میں ہونے والی یہ انحرافی کوششیں اگر ہمارے لیے قابلِ تقلید ہیں تو پھر کیوں نہ عالمی مقابلۂ حسن میں بھی شرکت کی تیاری کی جائے۔ کراچی میں پچھلے سال ایک ہوٹل میں تیرہ سالہ لڑکیوں کے درمیان ایک ایسا ہی مقابلہ "بے بی شو" کے نام سے منعقد کرانے کی کوشش ناکام ہو چکی ہے۔ ویسے ملائشیا کے ترقی پسند اس معاملے میں پہلے ہی سبقت لے چکے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ ۲۷ اگست ۸۶ء کو کوالالمپور میں ۸ مسلمان خواتین کے مابین ایک مقابلۂ حسن ہوا۔ اطلاعات کے مطابق لڑکیوں کو قابلِ اعتراض حالت میں دیکھنے کی اجازت صرف جیوری کے ارکان کو تھی۔ ملائشیا کے مشہور انگریزی روزنامہ "سٹریٹس ٹائمز" کے مطابق "ملائشیا چونکہ اسلامی ملک ہے، اس لیے یہاں لڑکیوں کا لباسِ غسل میں عام مردوں کے سامنے جانا معیوب سمجھا جاتا ہے۔"

۵۔ نفاذِ شریعت کے بہت سے ناقدین شریعت کو ماضی بعید میں عرب کے مخصوص رسم و رواج پر مبنی قرار دیتے ہیں ـــ یوں یہ لوگ شرعی احکام کو فرسودہ سمجھتے ہیں اور عہدِ حاضر میں ان کی افادیت کے منکر ہیں۔ اس نظریہ کے تحت اسلامی عقائد اور اسلامی شعائر کا حلیہ بگاڑنے کی بے شمار کوششیں کی جا چکی ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ خدا کے فضل سے اُمت کے اجتماعی ضمیر نے ان کوششوں کو پنپنے نہیں دیا۔ بہر حال اس ذہنیت کے عین مطابق سود کی حرمت اور جہاد کی فرضیت کو چیلنج کیا گیا۔ جھٹکا حلال ہوا، اسلامی سزائیں وحشیانہ بتائی گئیں۔ حکومت وقت کو زکوٰۃ کی شرح میں اضافہ کا مشورہ دیا گیا۔ کیونکہ بقول غلام احمد پرویز "زکوٰۃ کے نصاب یا شرح کا ذکر قرآن

ہیں نہیں" قربانی کی شرعی حیثیت مشکوک ہوئی۔ دلیل یہ دی گئی کہ "اگر کسی کو سنتِ ابراہیمی پہ عمل پیرا ہونا ہے تو اپنے بیٹے کو ذبح کر کے لٹائیے"۔ (بحوالہ قرآنی فیصلے از پرویز) سابق جسٹس منیر نے اسلامی ریاست کے تصور کا مضحکہ اڑایا۔ یہ پیگنڈہ یہ کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلم دوسرے درجے کے شہری ہوں گے (بحوالہ منیر رپورٹ) رختم نبوت کے بارے میں منتخب پارلیمنٹ کے فیصلے کی توہین ولی خان نے یہ کہہ کر کی کہ" پارلیمنٹ کو کوئی حق نہیں تھا کہ وہ قادیانیوں کو اقلیت قرار دے"۔ اور اب بیوروکریسی کی طرف سے انٹرمیڈیٹ کی سطح تک اسلامیات، مطالعہ پاکستان اور اردو کی لازمی حیثیت کو ختم کرنے کی تیاریاں ہیں۔ کیونکہ یہ مضامین "غیر بار آور یعنی NON PRODUCTIVE" پائے گئے ہیں۔ اقبالؒ نے کچھ ایسی ہی صورتِ حال پر تڑپ کر کہا تھا ؎

ہے کس کو یہ جرأت کہ مسلماں کو ٹوکے
حریتِ فکر کی نعمت ہے خدا داد
چاہے تو کرے کعبے کو آتش کدۂ پارس
چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد

۶۔ اسلام کے مستند عقائد اور مسلمہ تعلیمات کے برعکس یہ افکار ملتِ اسلامیہ نے آج تک قبول کیے ہیں نہ آئندہ اس کا امکان ہے۔ ان کے فروغ کی واحد صورت مسلمان ممالک میں شخصی یا یک جماعتی آمریت کا قیام ہے۔ ترقی پسند دانشور اسی لیے مسلمان معاشروں میں آمریت کے مداح خواں اور فوجی انقلابات کے لیے چشم براہ رہتے ہیں۔ سابق جسٹس منیر مرحوم کے نزدیک ایوب خان "وسیع المشرب انسان" تھے اور وارث میر کے نزدیک "ایوب خان جدید ذہن کا حکمران تھا۔ اور اس نے اپنے ترقی یافتہ نظریات مختلف کمشنوں کے ذریعے ملک میں نافذ کرنے کی کوشش کی"۔ یہ خراج تحسین اس شخص کے لیے ہے جس نے پاکستان میں جمہوری اور سیاسی عمل کو معطل

کردیا اور جس کے دورِ حکومت میں مرکزی پارلیمنٹ کا کام ہی محض صدارتی آرڈی ننس کی توثیق کرنا تھا۔ یہ درست ہے کہ پاکستان کے کمیونسٹ حضرات صدر ضیاء الحق کے مارشل لا کے حامی نہیں۔ لیکن اس ضیاء دشمنی کا تعلق جمہوریت دوستی سے نہیں بلکہ صدر ضیاء الحق کی اسلامائیزیشن اور افغان پالیسی سے ہے۔ عبداللہ ملک نے اپنی کتاب "تیسری دنیا، فوج اور اقتدارِ اعلیٰ" میں یہ مقدمہ (THESIS) پیش کیا ہے کہ تیسری دنیا میں تبدیلی لانے والے عناصر کمزور ہیں اور فوج ہی وہ طاقتور عنصر ہے جو صحت مند تبدیلیاں لا سکتا ہے۔ اس لیے فوج جب بھی صحت مند تبدیلیوں کے لیے اپنا اقتدارِ اعلیٰ استعمال کرے تو ترقی پسندوں کا فرض ہے کہ وہ فوج کی حمایت کریں۔ افغانستان میں روس کی فوج کشی پر ایک دنیا سراپا احتجاج ہے۔ خود روسی قیادت بھی اس غلطی پر سجدۂ سہو کرنا چاہتی ہے لیکن جام ساقی نے شاہ سے زیادہ شاہ پرست ہوتے ہوئے روسی مداخلت کے دفاع میں کہا ہے کہ "کسی ملک میں اگر سوشلسٹ انقلاب کو خطرہ ہو تو اس انقلاب کا تحفظ روس کی ذمہ داری ہے"۔ اس ضمن میں فوج کو ملوث کرنے کے لیے ترک فوج کی مثال کو قابلِ تقلید بنا کر پیش کیا گیا۔ میجر منظور حسن ریٹائرڈ لکھتے ہیں۔ "ترکی کی افواج اپنے ملک کے بانی مصطفےٰ کمال کے نظریات کی محافظت کو ہی فرضِ اوّلین

---

[1] ان حضرات کی تنگ دامانیٔ خیال اور فکری تضادات کا یہ حال ہے کہ یوں تو مارشل لا پر لعنت برسائیں گے، مگر یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ بڑی بڑی (CHANGES) جمہوریت کے ذریعے نہیں لائی جاسکتیں، خصوصاً اسلامی رجحانات کے خلاف لادینی اقدامات کا ثواب تو فوج ہی کما سکتی ہے۔ یہی بات اگر پلٹ کے کہو کہ اسلام کے مطلوبہ تغیرات کو نافذ کرنے کے لیے مغربی جمہوریت کے مقابلے میں ایسا مارشل لا بہتر ہے جس کے فوجیوں میں عام دین داری ہو اور جس کے کارپردازوں اور سربراہ میں غلبۂ اسلام کا انقلابی جذبہ ہو تو یہ ملائیت کے طعنے لے کر آپ پہ پل پڑیں گے۔ حالانکہ ہمارا رجحان جمہوری ذرائع کا ہے بشرطیکہ صحت مند جمہوریت ہو بھی۔

سمجھتی ہیں۔ اور جب بھی اس سمت میں انہیں خطرہ محسوس ہوا، اقتدار ہاتھ میں لے کر منفی اثرات کا قلع قمع کرتے ہوئے باگ ڈور دوبارہ صحیح قیادت کو سونپ دیتی ہیں۔ ان مقاصد کی خاطر وہاں کی افواج نے ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۱ء اور ۱۹۸۰ء میں سیاسی اقتدار پر قبضہ کیا۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں ایسا نہیں ہو سکا۔"

(مضمون "سیاسی جماعتوں کی رجسٹریشن اور نظریہ پاکستان"
جنگ ۸ فروری ۸۶ء)

یہ ہیں اس نظام کے حقیقی خدوخال جو نفاذِ شریعت سے گریز کی صورت میں پاکستان کا مقدر ہے۔

(بقیہ اسلامی نظام معاشرت کا ایک بہت اہم پہلو)

کر دیں۔ پڑوسی پڑوسی کے پہلو میں خار بن کر نہیں پھول بن کر رہے۔ ہمسایہ ہمسائے کے لیے سایۂ رحمت ہو جس کے دامن میں وہ مصائب کی تپش سے پناہ لے سکے۔ جار (ہمسایہ) مجیر (پناہ دہندہ) کے معنی میں بھی جار ہو۔ اور ہر گھر اپنے پڑوسی کے لیے صرف ہنگامی حالات میں نہیں، تمام حالات میں امدادی مرکز کا کام دے۔

بعض اوقات ہم آسمانوں کی سیر کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ ہماری جڑیں زمین میں ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے تمام منصوبے خیالی بن کر رہ جاتے ہیں۔ اگر اسلامی انقلاب انسانوں نے برپا کرنا ہے اور ہم اپنے قریب ترین انسانوں کے حقوق ادا نہیں کرتے تو انقلاب برپا کرنے والے انسان کہاں سے آئیں گے؟ اسلام کے نظامِ جوار کو اسلامی نظامِ حیات کے قیام کے لیے ایک مؤثر ذریعہ کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کا احیاء وقت کا اہم تقاضا ہے۔ یہ کام غیر معمولی ایثار اور قربانی کا مطالبہ بھی نہیں کرتا۔ صرف سوچ اور رویہ میں معمولی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ مصلحینِ امت کو اس کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے۔